غالب کی شاعری میں فلسفۂ وجودیت کے عناصر

ڈاکٹر محمد آصف*

Abstract:
Existentialism became prominent especially after World War I and II. In the sub-continent, the political, social and historical conditions during the age of Ghalib were almost are same and those when existentialism was becoming a strong philosophical movement in Europe. Since Ghalib was a mature and sensitive artist and he had a vision of the future, it should be no surprise that his poetry contains elements of existentialism. In fact, the recognition of the elements of existentialism in the poetry of Ghalib may help in the proper understanding of the philosophy of existentialism itself. Ghalib's verses provide an effective, poetic interpretation of the complex philosophy of existentialism.

وجودیت عہد جدید کی نہ صرف نمائندہ فکری تحریک ہے بلکہ عصر حاضر کا فکری مرقع ہے۔اس عہد کی مخصوص بے چینی، کشیدگی، تشویش، کھنچاؤ، مادہ پرستی اور مشنیت جو ہولناک جنگوں، تباہ کن ہتھیاروں، شدید سماجی انقلابوں، اختیار پسند اور فرد دشمن عقیدوں اور روحانیت کے زوال کا نتیجہ ہیں ان سب کا اظہار وجودیت میں ہوا ہے ۔[۱] وجودیت کی تحریک میں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے علم وحکمت ہو یا ادب وفن، الہیات ہو یا نفسیات، عمرانیات ہو یا اخلاقیات وجودیت نے ان سب پر انمٹ نقوش مرتسم کیے ہیں۔[۲] اس کے کئی تصورات ہمارے صوفیاءکرام کے افکار سے قریبی مماثلت رکھتے ہیں۔علاوہ ازیں جدید اردو ادب بالخصوص شاعری پر اس فلسفے کا گہرا پرتو ہے۔[۳] چنانچہ اقبال، راشد، فیض، مجید امجد جیسے بڑے بڑے اور مستند شعرا کے ہاں اس تحریک کے اثرات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔[۴] جہاں تک غالب کا تعلق ہے تو غالب بنیادی طور پر انسان یا انسانیت کی افاقی قدروں کے شاعر ہیں، اُن کے ہاں ایک ذوق نمو ایک جوش حرکت حیات کی جھلک ہے، جو اندرونی، داخلی طور پر مستقبل کی طرف ایک آنے والے دور کی طرف اشارہ کرتا ہے۔رجائیت کے فقدان کے باوجود غالب کے ہاں پست اور مریضانہ قنوطیت بہت کم ہے۔سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی وہ ایک قابل تعریف خودداری ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اُن کے اظہار تکلیف میں بھی ایک طرح کی آن بان ہے۔ [۵] اسی قابل تعریف خودداری، آن بان اور تمکنت کی وجہ سے اُن کی شاعری ''میں'' یا ''انا'' یا ''انفرادیت'' یا وجود کے اثبات کا مرقع بن کر رہ گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ زمانہ کے اختلاف اور

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

دوری کے باوجود اُن کی شاعری میں فلسفہ وجودیت کے عناصر بکثرت تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

زمانی اعتبار سے بھی دیکھئے تو فلسفۂ وجودیت غالب (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) کے بعد بالخصوص جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۹ء) اور جنگِ عظیم دوم (۱۹۳۹ء۔۱۹۴۰ء) کے بعد کی پیداوار ہے۔لیکن جو سیاسی سماجی حالات وجودیت کے پس منظر میں یورپ میں تھے کم وبیش ایسے ہی تہذیبی حالات اور ٹوٹتے بکھرتے مناظر غالب کے عہد میں برصغیر میں موجود تھے۔اس لیے غالب جیسے باشعور، حساس اور مستقبل شناس فن کار کے ہاں اگر وجودیت کے عناصر موجود ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

جنگِ عظیم اوّل اور جنگِ عظیم دوم کے بعد کی پُر آشوب سیاسی، سماجی، معاشی اور ذاتی صورت حال اور سارتر کے الفاظ میں نوآبادیات کا شکستہ، فاقہ زدہ، بیمار اور خوف زدہ ''دیسی باشندہ''[۶] نوآبادیاتی نظام کی بظاہر شکست وریخت کے بعد امریکہ و یورپ کا شکل بدلتا ہوا نیا نوآبادیاتی نظام، انسانی خون کی ارزانی، موت کے سائے، دُکھ، اذیت، خوف، کربِ مسلسل، مایوسی و نا اُمیدی، بے یقینی، زندگی کی بے معنویت و لایعنیت، ذہنی انتشار، اعصابی خلل، نفسیاتی اُلجھنیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور ہر محاذ پر قدیم اقدار و نظریات کی شکست، فرد کا مشین بن جانے اور اجتماع میں گم ہونے کا احساس، کائنات کی وسعتوں میں فرد کی کم مائیگی اور احساسِ تنہائی، تقدیر کی بالادستی، جمہوریت کے نام پر آمریت کا استبداد، شخصی آزادی کی تباہی، عظیم آدرشوں کے نام پر لوٹ مار، فساد، نفرت، جھوٹ، مکروفریب، بے سکونی......غرض ان تمام حالات میں اجتماعی مفادات اور اجتماعی نظام کی بجائے انفرادی مفادات اور انفرادیت کو بچانے کے لیے وجودیت نے تھکے ہارے انسان کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

غالب بھی اپنے دور میں کم وبیش ایسے ہی ٹوٹتے بکھرتے مناظر سے دوچار ہوئے۔۱۸۵۷ء کا انقلاب، عظیم الشان مغل سلطنت کا انہدام، قتل و غارت کے واقعات، انگریزوں کی چیرہ دستیاں، مغل حکمرانوں کی بے بضاعتی ، اپنوں کی غداری، تنگ نظری اور روشن خیالی کی آویزش، عقائد کی شکست وریخت، جدید علوم اور ٹیکنالوجی کے اثرات کا آغاز، قدیم وجدید تہذیب کی کشمکش، غیر واضح مستقبل اور تشکیک و تجسس، اعصابی تناؤ، موت، دُکھ، اذیت، سہمی ہوئی فضا، اپنوں کے بچھڑنے کا احساس پھر غالب کی اپنی ذاتی محرومیاں اور احساسِ انا......ان تمام حالات و واقعات میں (یعنی پس منظر کی مشابہت کی بناء پر) غالب نے بھی انسانی صورت حال کو وجودیوں کے انداز میں سوچا اور محسوس کیا اس لیے ان کے ہاں ''فرد کو بچانے کا قوی رجحان نظر آتا ہے۔ بنیادی انسانی صورت حال کے بارے میں ان کے بعض اشعار اتنے پرتاثیر اور قوی ہیں کہ وجودیت کا ''فلسفہ'' اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔[۷]

وجودیت میں والدین، لواحقین، معاشرت، رسوم ورواج اور ماضی سے ہٹ کر صرف اپنے ''وجود'' پر زور دیا جاتا ہے۔یعنی ''چاہیے'' کی بجائے ''میں ہوں''، ''میں کون ہوں؟''، ''مری حقیقت کیا ہے؟'' کو زیرِغور لایا جاتا ہے۔نیتجتاً بھری دنیا میں ''تنہائی'' اور اس سے پھوٹنے والے عناصر مثلاً غم، اضطراب، اُداسی، نا اُمیدی، تشویش، حسرت ویاس، خوف، احساسِ محرومی، کرب، احساسِ شکست اور موت کا خوف جیسی کیفیات جنم لیتی ہیں۔لیکن اگلے ہی مرحلے پر وجودی ان حقیقتوں کو لازمی اور نا قابل انکار حقائق سمجھ کر قبول کرتا ہے تو ایک مثبت روّیہ پیدا ہوتا ہے۔چنانچہ اثباتِ ذات، اعتماد، شعور و آزادی، انتخاب وارادہ، حوصلہ، زندگی کی طرف رجحان، جدت، تخلیقِ نو، آرزوئے مسلسل، تقلید سے گریز......غرض ان مثبت ومنفی اور بظاہر متضاد لیکن مربوط کیفیات وخصائص کا مرکب وجودیت کہلاتا ہے۔[۸]

فلسفۂ وجودیت کے مفکرین دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ان میں سے ایک گروہ کا رجحان مذہب کی طرف ہے ڈنمارک کا الہیاتی فلسفی کرکیگارڈ اس گروہ کا سرکردہ ہے۔اس کی وجودیت الہیاتی وجودیت ہے۔دوسرے گروہ کا رجحان الحاد کی طرف ہے جو صرف وجود کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے۔اس گروہ کے نزدیک خدا کی موجودگی بے ضرورت ہے اس لیے کہ انسان خود اپنا کارساز ہے اس گروہ کا سرکردہ فرانسیسی ناول نگار، ڈرامہ نگار اور دانشور سارتر ہے۔[۹] ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول سارتر نے اپنے اس تصور میں فرانس کی روح کو سمو دیا اور اس سے وہ کام لیا جس سے ادب وفن کے شعبے بھی متاثر ہوئے۔[۱۰] سارتر نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور اس کے بعد کی دردناک ٹوٹتی بکھرتی منتشر صورتحال کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا نہ صرف یورپ اور امریکہ کے نوآبادیاتی نظام کو مستحکم ہوتے ہوئے دیکھا بلکہ ظلم وبربریت کے خلاف مزاحمت میں عملی طور پر حصہ لیا اور انسان کی مطلق آزادی کا تصور پیش کرتے ہوئے تحریک مزاحمت میں نئی روح پھونکی۔اس نے کیوبہ اور ویت نام میں امریکی سامراج کی جنونی مداخلت کی پرزور مخالفت کی۔سارتر کی سامراج دشمنی غیر ممالک تک محدود رکھی بلکہ اس نے اپنے ہی ہم وطنوں (فرانسیسی) کے ظلم وتشدد کے خلاف ہمیشہ الجزائری حریت پسندوں کا ساتھ دیا۔اور ہر ممکن طریقہ سے اُن کی جدوجہد آزادی کی تائید کی۔ [۱۱] اُس نے ظلم کے خلاف مزاحمت کے لیے اور وجودیت کے فلسفے کو تحریک کی صورت دینے کیلئے ادب تخلیق کیا اور ادب کو نئے انداز میں متاثر کرنے کی کوشش کی۔چنانچہ ادب سارتر کے نزدیک انسان کے وجود کو ثابت کرنے کا وسیلہ ہے اور اس کے ذریعے ادیب اپنے ہی وجود کو دریافت کرتا ہے۔[۱۲]

غالب کی شاعری کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وجود کا اثبات اور وجود کی دریافت، یہ اُلفتِ

ذات اور اُلفتِ ہستی غالب کی شاعری کا بنیادی پہلو ہے۔ یہ آزادی اُن کا بنیادی مزاج ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے [۱۳]

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا [۱۴]

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں [۱۵]

اور یہ خوبصورت شعر تو گویا غالب کے اثبات ذات اور الفت ہستی کا مرقع بن کر رہ گیا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے [۱۶]

انفرادیت، آزادی، انتخابِ ارادہ، جدت، تخلیقِ نو، تقلید سے گریز، احساسِ انا غالب کے بنیادی اوصاف میں سے ہیں۔ وجودیت کے تصورِ آزادی وانتخاب کے تحت اگر غالب کے ہاں اشعار کی تلاش کی جائے تو بالکل نئے مطلب و معانی سامنے آتے ہیں۔ غالب بھی ''سرگشتۂ خمارِ رسوم وقیود'' نہیں۔ ان کو بندھے ٹکے قواعد وضوابط سے نفرت ہے۔ غالب فرسودہ اور گھسی پٹی راہوں پر چلنے کی بجائے نئی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا [۱۷]

یہی وجہ ہے کہ ''کوہکن کے تیشے سے مرنے کو رسوم و قیود کا خمار سمجھنا'' اور اُسے ''نقاشِ تمثالِ شیریں قرار دینا''، ''تنک ظرفیِ منصور'' کو نامنظور کرنا، ''کوہِ طور کو سیرِ نو'' کی خواہش کرنا، ''جنت کی حقیقت کا خیال'' سمجھنا اور ''طاقِ نسیاں کا گلدستہ'' تصور کرنا...... یہ تمام جذبات وخیالات ان کی جدت وانفرادیت اور اپنے وجود کی اہمیت کو باور کرانے پر زور دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کوہ کن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا [۱۸]

؎ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں [۱۹]

؎ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی [۲۰]

؎ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے [۲۱]

؎ ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اِک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا [۲۲]

دیوانِ غالب کے پہلے شعر میں بظاہر کائنات کی ''فریادی'' اور ''کاغذی'' حیثیت کو پیش کیا گیا ہے لیکن پس پشت جو جذبۂ آزادی، ارادہ وانتخاب کی خواہش کارفرما ہے اسے ملاحظہ کیجیے:

؎ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا [۲۳]

موجودہ دور میں مستقبل غیر یقینی ہے جس سے سوال جنم لیتا ہے یہ بالکل ویسا ہی استفہام واستفسار اور تجسس وتشکیک ہے جو غالب کے دور میں تہذیبی کشمکش یا تہذیب کی شکست کے بعد پیدا ہوا اور غالب نے اس کا اظہار اس طرح کیا:

؎ ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا ہے مرے آگے [۲۴]

احساسِ تنہائی وجودیت کی بنیادی صفت ہے۔ غالب کے ہاں یہ تنہائی دو سطحوں پر نمایاں ہوئی ہے۔(۱) عمومی اور انسانی سطح (۲) تخلیقی سطح۔

عمومی سطح میں تمام انسان یکساں طور پر تنہائی اور اس سے پھوٹنے والے نفسیاتی عناصر مثلاً کرب، مغائرت، غم، اضطراب، تشویش، حسرت ویاس وغیرہ کا شکار ہوتے ہیں۔ یعنی تنہائی کی بنیادی انسانی صورت حال۔ تخلیقی سطح جو فن کار سے مخصوص ہے۔ عظیم تخلیقی فن کار اپنی بلند ترین افتادِ طبع اور ندرتِ فکر کی بدولت عوام الناس کی سطح سے کٹ کر تخلیقی کرب وتنہائی سے گزرتا ہے۔ غالب کے ہاں یہ دونوں عناصر تلاش کیے جا سکتے

ہیں۔[۲۵]

غالب نے اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں ''قیدِحیات''، ''بندِغم''، ''سخت جانی ہائے تنہائی'' کے ذریعے اسی بنیادی انسانی صورت حال کو پیش کیا ہے جس سے انسان ازلی وابدی طور پر دوچار ہے۔یعنی تنہائی، کرب، غم وغیرہ۔

؎ کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا [۲۶]
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں [۲۷]

موجودہ دور کا انسان جس طرح آرزوؤں اور اُمنگوں کا حامل ہے، جس طرح مسلسل شکستِ آرزو سے حسرت ویاس کا شکار ہوا ہے، جس طرح اذیت پسندی کا عادی بن چکا ہے______ یہ تمام صورتِ حال غالب کے ہاں بھی موجود ہے۔

؎ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے [۲۸]
طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے [۲۹]

بلاشبہ غالب کے ہاں قنوطیت اور اس سے وابستہ یاسیت، احساسِ تنہائی، اور احساسِ محرومی کے اثرات بھی موجود ہیں جو کہ وجودیت ہی کی ایک صفت ہے۔لیکن ان کو بحیثیت مجموعی قنوطی سمجھنا درست نہیں ہے۔اس لیے کہ انھوں نے تنہائی اور اس سے متعلقہ نفسیاتی عوامل کو ناقابل تردید حقیقت سمجھ کر قبول کیا ہے۔جس سے ان کے ہاں ایک مثبت روّیہ نے جنم لیا ہے۔غالب کو معلوم تھا کہ ان کی تہذیب ایک نئی تہذیب میں ڈھل رہی ہے اور اس سے انکار ناممکن ہے۔غالب اپنے سفرِ کلکتہ کے دوران جدید انگریزی تہذیب کے زیر اثر آنے والے نئے زمانوں کی آہٹوں کو سن چکے تھے۔اس کا واضح اشارہ غالب نے نہ صرف اس شعر میں کیا ہے ''ایماں مجھے روکے ہے ......الخ'' بلکہ اِس کا واضح نقشہ آئینِ اکبری کی اس منظوم فارسی تقریظ میں بھی کھینچا ہے جو انھوں نے سرسیّد کی فرمائش پر لکھی تھی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اب بحری جہازوں اور دخانی انجنوں کا دور ہے۔اب چقماق کی بجائے تنکے سے آگ پیدا کرنے کا دور ہے۔اب حروف پرندوں کی طرح پرواز کرتے ہیں۔اب قدیم آئین وانصرام پر لکیر

کے فقیر کی طرح چلتے رہنے کی ضرورت نہیں۔اب ایک نئی تہذیب ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہے۔

صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و اندازِ ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس نہ دید ، آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
حقِ ایں قوم است ''آئیں'' داشتن — کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند — ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند — ایں ہنرمنداں زخس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند ایناں بر آب — دُود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دُخاں ، کشتی بہ جیحوں می برد — گہ دُخاں ، گردوں بہ ہاموں می برد
از دُخاں زورق بہ رفتار آمدہ — باد و موج ، ایں ہر دو بیکار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند — حرف چوں طاہر بہ پرواز آورند
ہیں ، نمی بینی کہ ایں دانا گروہ — در دودم آرند از صد کروہ
می زنند آتش بہ باد اندر ہمی — می درخشد باد چوں اخگر ہمی
رو بہ لندن کا ندراں رخشندہ باغ — شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
کاروبارِ مردمِ ہشیار بیں — در ہر آئیں صد نو آئیں کار بیں
پیشِ ایں آئیں کہ دارد روزگار — گشتہ آئینِ دگر تقویم پار
ہست ، اے فرزانۂ بیدار مغز؟ — در کتاب ایں گونہ آئیں ہائے نغز
چوں چنیں گنجِ گوہر بیند کسے — خوشہ زاں خرمن چرا چیند کسے
مبداءِ فیاض را مشمر بخیل — نور می ریزد رطب ہا زاں نخیل
مُردہ پروردن ، مبارک کار نیست — خود بگو ، کاں نیز جز گفتار نیست [۳۰]

بقول سبطِ حسن:

''اِس نظم میں مرزا غالب سیّد احمد خان کو اشارۃً کنایۃً بھی مغربی تہذیب کو اپنانے کا مشورہ نہیں دیتے۔ان کو انگریزوں کی پوشاک،

خوراک سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ وہ صاحبانِ عالی شان کی طرزِ بود ماند سے مرعوب ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنی مادری زبان ترک کر کے انگریزی زبان اختیار کر لو اس لیے کہ غالب کو اپنی مشرقی تہذیب پر بڑا ناز تھا اور انہوں نے آخر وقت تک اپنی مشرقی قدروں کو بڑی آن بان سے نبھایا۔ البتہ وہ ہماری سوچ کا انداز بدلنا چاہتے تھے۔ وہ ''کہنگی'' اور ''مردہ پرستی'' کے سخت دشمن ہیں...... دیرِ کہن تو کیا وہ تو ''قاعدۂ آسماں'' کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔[۳۱]

ے
رفتم ، کہنگی زتماشا برافگنم
در بزمِ رنگ وبو نمطی دیگر افگنم
در وجدِ اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست
ناہید را بہ زمزمہ از منظر افگنم [۳۲]

ے
بیا کہ قاعدۂ آسماں بہ گردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم
ے
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
ے
زحیدریم من و تو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم [۳۳]

غالب نے کوشش کی تھی کہ سر سیّد کی توجہ مغرب کی نئی نئی ایجادات اور سائنسی انکشافات کی طرف کرائیں۔ کوئلے اور بھاپ سے چلنے والی مشینیں تار برقی، گیس، دیا سلائی، نظامِ مملکت وغیرہ۔ سبطِ حسن کا نقطۂ نظر بالکل درست ہے کہ:

''اٹھارہویں صدی میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ملک میں

طوائف الملوکی، لاقانونیت اور افراتفری پھیلی اُس کے پیشِ نظر
مرزا غالب برطانیہ کے نافذ کردہ آئینِ نو کی طرف داری کرنے
میں یقیناً حق بجانب تھے۔اس نئے آئین کے آگے آئینِ اکبری
کی حیثیت واقعی پرانی جنتری سے زیادہ نہ تھی۔'' [۳۴]

مغربی تمدن کی خوبیوں کا ادراک، مشرقی قدروں پر ناز، کہنگی و مردہ پرستی سے بیزاری اور قاعدۂ آسماں کو بدلنے کی خواہش، غالب کی اثباتِ ذات کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ غالب کو جہاں اپنی قدیم تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کا غم ہے اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی کا احساس ہے وہاں اُن کے ہاں نئی تہذیب کی مثبت اقدار کی بدولت زندگی کی مثبت تبدیلیوں کا احساس بھی ہے اور اسی لیے ان کے ہاں ایک جراٴت مندانہ طرزِ عمل پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں غم اور تنہائی کے ساتھ ساتھ اثباتِ ذات اور ارادۂ و انتخاب کے مضامین نے بھی جنم لیا ہے۔ چنانچہ وہ موت کو جینے کا مزا حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں:

؎ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا [۳۵]

غالب کے ہاں دوسرا رویّہ تخلیقی تنہائی کا ہے۔ غالب کا ذہن اپنے عہد سے بہت آگے کا ذہن تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنے ذہن، خیالات اور جذبات کا اظہار کیا تو ان کو نظرانداز کر دیا گیا۔ جس کی بدولت غالب کے ہاں وہ تخلیقی تنہائی اور تخلیقی کرب پیدا ہوا جو ہر نابغہ کا حصہ ہے۔ جب غالب ہی کی زندگی میں ان کو ناقدری کی نگاہ سے دیکھا گیا تو انہوں نے بڑی شانِ بے نیازی سے اپنے ''شعری وجود کا اثبات'' اس طرح کیا:

؎ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی ، نہ سہی [۳۶]

اور یہ اشعار بھی دیکھیے:

؎ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھا
بے سبب ہوا غالب ، دشمن آسماں اپنا [۳۷]

؎ میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا [۳۸]

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب کے کلام میں نہ صرف فلسفۂ وجودیت کے عناصر بکثرت تلاش کیے جا سکتے ہیں بلکہ فلسفۂ وجودیت کو سمجھنے کے لیے غالب کے کلام میں وجودی عناصر کی تلاش ضروری بھی ہے۔فلسفہ کی ادق زبان میں موجود وجودیت کے تصورات کی پُر اثر شعری تفہیم میں غالب کے اشعار حیرت انگیز طور پر ہماری مدد کرتے ہیں جن میں بے ساختگی بھی ہے اور دلکشی بھی۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ از قاضی جاوید، وجودیت تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۸ء، صفحات ۱۱۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، صفحات ۹-۱۰۔

۴۔ از شاہین مفتی، ڈاکٹر؛ اُردو نظم میں وجودیت، (تفصیل کے لئے دیکھئے)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء (اس کتاب میں اقبال، راشد، میراجی، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، منیر نیازی، وزیر آغا، انیس ناگی، اور کشور ناہید وغیرہ کے ہاں وجودیت اور اس کے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے)

۵۔ از عزیز احمد، ترقی پسند ادب، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۴۵، ۴۶۔

۶۔ پیش لفظ از سارتر، مشمولہ، افتادگانِ خاک، فینن، ترجمہ، محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۶ء، صفحات ۷ تا ۲۰

۷۔ نعیم احمد، ڈاکٹر؛ مضمون، غالب اور فلسفۂ وجودیت مشمولہ ''ماہِ نو'' (خصوصی اشاعت غالب نمبر)، شمارہ نمبر ۳، جلد نمبر ۵۱، مطبوعاتِ پاکستان، لاہور، مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۴۱

۸۔ وجودیت کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ کیجیے:

i. قاضی جاوید، وجودیت صفحات ۱۱ تا ۲۲؛

وجودیت، بالخصوص کرکیگارڈ (۱۸۱۳ء۔۱۸۵۵ء) کی الٰہیانی وجودیت اور ژاں پال سارتر (۱۹۰۵ء۔) کی الحادی وجودیت سے متعلق مضامین ''سورین کرکیگارڈ...... عقل تو کسبی ہے''، ''ژاں پال سارتر...... وجود جوہر پر مقدم ہے''، مذکورہ کتاب کے صفحات ۲۳ تا ۳۶ اور ۷۷ تا ۹۸؛

ii. قاضی جاوید، مضمون، وجودی فلسفے کے منظر اور پس منظر کا اجمالی مطالعہ، مشمولہ فلسفہ جدید کے خدو خال، مرتبہ پروفیسر خواجہ غلام صادق نگارشات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۸۹ تا ۱۰۴۔

iii. انور سدید، ڈاکٹر؛ اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۷ تا ۱۲۰۔

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر؛ اُردو ادب کی تحریکیں، ص ۱۱۸۔

۱۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۳۶۹۔

۱۱۔ قاضی جاوید، وجودیت، ص ۸۱۔

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر؛ اُردو ادب کی تحریکیں، ص ۱۱۸۔

۱۳۔ حامد علی خاں، دیوانِ غالب، بہ تصحیح متن و ترتیب، الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۸۔

۱۴۔ ایضاً، ص۶

۱۵۔ ایضاً، ص۸۹

۱۶۔ ایضاً، ص۱۲۰

۱۷۔ ایضاً ص۲

۱۸۔ ایضاً، ص۳۵

۱۹۔ ایضاً، ص۸۲

۲۰۔ ایضاً، ص۱۸۵

۲۱۔ ایضاً، ص۱۴۴

۲۲۔ ایضاً، ص۹

۲۳۔ ایضاً، ص۱

۲۴۔ ایضاً، ص۱۷۰

۲۵۔ نعیم احمد، ڈاکٹر؛مضمون، غالب اور فلسفۂ وجودیت، مشمولہ ''ماہِ نو'' (خصوصی اشاعت غالب نمبر)،ص۴۷،۴۸

۲۶۔ حامد علی خاں، دیوانِ غالب، بہ تصحیح متن وترتیب،ص۱

۲۷۔ ایضاً، ص۹۴

۲۸۔ ایضاً، ص۱۷۸

۲۹۔ ایضاً، ص۱۶۵

۳۰۔ مرتضٰی حسین، سیّد فاضل لکھنوی، غالب، کلیاتِ غالب فارسی (جلد سوم)، مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ۳۱۵ تا ۳۱۷

۳۱۔ سبطِ حسن، سیّد، نوید فکر، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص۱۳۷

۳۲۔ غالب، کلیاتِ غالب فارسی، جلد سوم، ص۲۶۷

۳۳۔ ایضاً، ص۲۹۳۔۲۹۴

۳۴۔ سبطِ حسن، سیّد، نوید فکر، ص۱۳۸

۳۵۔ حامد علی خاں، دیوانِ غالب، بہ تصحیح متن وترتیب، ص۲۰

۳۶۔ ایضاً، ص۱۴۳

۳۷۔ ایضاً، ص۳۶

۳۸۔ ایضاً، ص۴